(غلام گردش)

موسیقی کا درزی!

غلام نبی چلہن کپڑے سینے کا کام کرتا ہے۔ وسائل کیا ہونگے۔ حد درجہ محدود۔ دکان بھی سانگھڑ کے چھوٹے سے قصبے شاہ پور چاکر میں ہے۔ سندھ کے بڑے شہروں میں مقیم لوگ بھی شائد اس گاؤں کو نہ جانتے ہوں۔ ویسے بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ محدود سے محدود تر ہو جاتے ہیں۔ جب ضروریات کی ساری چیزیں اور زندگی کے تمام وسائل محض چند کلومیٹر میں میسر ہوں، تو باہر جھانکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیشتر لوگ اپنی ذات سے باہر دیکھنا مناسب بھی نہیں سمجھتے۔ مگر زندگی نام ہی تنوع اور انوکھے تجربات کرنے کا ہے۔ ہر ذاتی شوق جو لگی بندھی زندگی سے باہر لے جائے، وہی سانس لینے کا اصل جواز ہے۔ غلام نبی نے جو کام کر ڈالا ہے، حیرت انگیز طور پر منفرد اور کمال ہے۔ ساٹھ برس کا یہ بزرگ نوجوان پورے ملک سے پرانے ریکارڈ تلاش کرتا ہے۔ کالے رنگ کے توے۔ جن سے موسیقی کا نور پھوٹتا ہے۔ موجودہ دور میں ریکارڈ کا نام بھی کم لوگوں کے علم میں ہوگا۔ توے کیا، اب تو سی ڈی بھی متروک ہو چکی ہے۔ تمام موسیقی بلیوٹوتھ کے ذریعے سنی جاتی ہے۔ گانے کے ریکارڈ تو چالیس پچاس برس پرانا قصہ ہے۔ میں کیونکہ پچھلی صدی کا آدمی ہوں۔ اسلیے ان سیاہ توؤں کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہوں۔ گانے کے ہر ساز اور گلوکار کے ہر سُر کو علیحدہ علیحدہ کر کے غور سے سننا صرف اور صرف انہی قدیم ریکارڈروں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ چہلن نے اپنے نایاب شوق کے تحت گزشتہ پندرہ برس سے ملک کا چپہ چپہ چھانا ہے۔ جہاں بھی موسیقی کے دلدادہ کا معلوم پڑا، وہاں پہنچا اور ان سے پوچھا کہ کیا آپکے پاس پرانے ریکارڈ موجود ہیں۔ بیشتر لوگوں کا جواب نفی میں ہوتا ہے۔ مگر معدودے چند لوگ تھے جنہوں نے بتایا کہ ہاں، انکے پاس یہ خزانہ موجود ہے۔ غلام نبی ان سے ریکارڈ خرید لیتا ہے۔ ایک دہائی سے زیادہ عرصے پر محیط یہ شوق نہیں، مشغلہ نہیں، بلکہ جنون ہے۔ جسکی بدولت اس شخص نے موسیقی کا انمول ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔

غلام نبی کے اس عشق نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ ہر سال، شاہ پور چاکر میں ایک مجلس منعقد کرتا ہے۔ پورے ملک سے سینکڑوں لوگ آتے ہیں۔ ہر شخص اپنی مرضی کے چار ریکارڈ گراموفون پر بجاتا ہے اور تمام لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کمال بات یہ بھی ہے کہ کٹھ میں موجود ہر شخص کسی بھی زبان اور علاقے کی موسیقی سنا سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر غیر متعصب رویہ اور کیا ہوگا۔ ویسے موسیقی تعصب کی مضبوط سے مضبوط دیوار پھلانگ کر دل کی کواڑ پر دستک دیتی ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس طلسم کا اَسیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غلام نبی واجبی تعلیم یافتہ انسان ہے۔ مگر موسیقی کے جادو اور اسکی تاثیر کو خوب سمجھتا ہے۔ روایت کے مطابق ٹھیک دو ہفتے پہلے شاہ پور چاکر میں ایک خیمہ لگایا گیا۔ دریاں بچھائی گئیں۔ خیمے کی پیشانی پر ''سنگیت سملن'' کا بینر آویزاں کیا گیا۔ مطلب میوزیکل کانفرنس ہے۔ ساتھ ساتھ پرانے گائکوں کی تصاویر بھی لگائی گئیں۔ اکثریت ایسے فنکاروں کی تھی جنہیں عام لوگ یاد تک نہیں رکھتے۔ مگر اپنی جگہ اور اپنے وقت کے ان عظیم گلوکاروں کی آواز آج تک زندہ ہے۔ قیامت کی سردی کے باوجود ٹینٹ میں موجود تمام شائقین گھنٹوں دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ چائے کے اَن گنت دور جسم میں حرارت پیدا کرتے رہے۔ مگر اصل گرمی موسیقی کے انمول گیت

پیدا کرتے تھے۔ذرا غور فرمایئے کہ وہاں کیا کیا سنا جاتا رہا۔جیون بائی، ماسٹر کنول رام، زرینہ بلوچ، ماسٹر چندر، مسری فقیر، ڈھول فقیر، محمد رفیع اور لتا منگیشکر۔ہاں ایک اور نام۔گوہر سلطانہ۔یہ 1902 کی لازوال گائکہ تھی۔ہوسکتا ہے کہ آپ ان تمام ناموں سے بخوبی واقف ہوں۔مگر طالبعلم ان میں سے پچاس فیصد گلوکاروں سے ناواقف ہے۔نئی نسل کے متعلق تو خیر کچھ بھی عرض نہیں کرسکتا۔انہیں کتنا معلوم ہوگا۔اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔قیافہ ہے کہ اکثریت کیلئے یہ تمام نام اجنبی ہونگے۔سنگیت سامِلن میں اس مرتبہ سینکڑوں لوگ انتہائی انہماک سے موسیقی سنتے رہے۔داد کے جملے فضا میں گردش کرتے رہے۔رات کیسے ختم ہوئی، کسی کو معلوم تک نہ ہوسکا۔صبح تک چلنے والی اس محفل میں صرف ایک قدر یکساں تھی۔موسیقی سے محبت۔لوگوں نے پنجاب، آزاد کشمیر، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان سے سینکڑوں میل سفر کرکے اپنے خرچے پر شمولیت اختیار کی تھی۔ہر ایک کے پاس پرانے ریکارڈ موجود تھے۔اپنی باری پر پسند کی موسیقی دوسروں کو سناتے رہے۔

سنگیت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ریکارڈ بجانے کیلئے پرانے گراموفون۔شائد اس لفظ سے اکثر لوگ اجنبی ہونگے۔عرصہ ہوا گراموفون نہیں دیکھا۔مگر چند لوگ ضرور جانتے ہونگے۔پہچانتے بھی ہونگے۔گراموفون وہ محیرالعقول آلہ ہے جس پر یہ کالے توے چلتے ہیں۔یہ ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ایک نہ ہو، تو سارا کام اُدھورا رہ جاتا ہے۔غلام نبی نے ایک اور مسئلہ بتایا ہے۔کہ اب پرانے گراموفون میسر نہیں ہیں۔اگر کاٹھ کباڑ، کسی شوقین کے پاس موجود ہو بھی، تو اسکی حالت اچھی نہیں ہوتی۔تکلیف دہ اَمر یہ بھی ہے کہ گراموفون کو ٹھیک کرنے والے لوگ بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔غلام نبی کیونکہ ایک دیوانہ انسان ہے۔اسلیے انتہائی محدود وسائل کے باوجود اسکے پاس تین گراموفون موجود ہیں۔ان میں 1932 کا ایک گراموفون بھی موجود ہے جو چابی سے چلتا ہے۔یہ نایاب گراموفون کس طرح غلام نبی نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔بذاتِ خود ایک عجوبہ ہے۔اس سے بھی بڑھ کر وہ درست حالت میں ہے اور اس پر ریکارڈ آج بھی چلتے ہیں۔یہ پرانی ٹیکنالوجی ہے۔لہذا خراب ہونے کی صورت میں اسکے پرزے ملنے بہت مشکل ہیں۔تقریباً ناممکن۔سنگت میں شامل کئی شائقین نے بتایا کہ پرانے ریکارڈ تلاش کرنے کیلئے طویل سفر کرتے ہیں۔جنکے پاس یہ ریکارڈ موجود ہیں، کم ازکم دس ہزار روپے میں ایک تو افروخت کرتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ ایک مہنگا شوق ہے۔اس دیوانگی کیلئے انہیں ملک سے باہر بھی کوشش کرنی پڑے، تو وہ بے دریغ کرتے ہیں۔کالے توؤں کی بہت تعداد ہندوستان سے بھی منگوائی جاتی ہے۔غلام نبی کے پاس ریکاڈوں کا محیرالعقول خزانہ ہے۔تقریباً دس ہزار۔ان میں بنگالی، پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچی، اُردو اور گجراتی، ہر زبان کے گانے محفوظ ہیں۔شائقین میں ایک ستر سالہ بزرگ عطا محمد جمالی بھی ہیں۔جو سرکنڈ کا باسی ہے۔ 1971 سے، جہاں علم ہوتا ہے کہ ریکارڈ موجود ہیں، جمالی وہاں صرف اور صرف شوق کی خاطر پہنچ جاتا ہے۔سندھی میوزک کا جو ذخیرہ جمالی کے پاس موجود ہے۔بذاتِ خود کسی بھی شخص کو حیرت زدہ کرتا دیتا ہے۔غلام نبی اور اسکے دیگر دوست کانفرنس کا انعقاد اپنے وسائل سے کرتے ہیں۔حکومتی امداد کا ذرہ تک نہیں ملتا۔ویسے سندھ کی حکومت سے یہ توقع کرنا کہ ایک چھوٹے سے قصبے میں چند دیوانوں کی سرپرستی کریگی، کم ازکم طالبعلم کیلئے تو ایک خواب سا ہے۔مگر ضلعی انتظامیہ بھی اس معاملے میں گونگی ہے۔بھلے زمانے میں اس طرح کے شائقین کی مالی سرپرستی ڈپٹی

کمشنر کیا کرتا تھا۔مگراب تو یہ فریضہ دھند میں گم سا ہوگیا ہے۔ویسے ہی جیسے اکثر بہترین کام ملک عدم کے مسافر ہو چکے ہیں۔جیسے گورنس،صحت،تعلیم،اچھے ہسپتال،خالص غذا۔کس کس کا ماتم کیا جائے اورکون کون سا مرثیہ پڑھا جائے۔جو موجود ہے،وہی غنیمت ہے۔بے اعتنائی کا عالم دیکھیے۔کہ مجھے اس کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں ایک غیرملکی جریدے سے معلوم ہوااوروہ بھی مکمل طور پر اتفاقاً۔لہذا کیا شکوہ کروں۔اب تو یہ حالت ہے کہ شکایت تو دور کی بات،دکھ ہونا بھی معدوم ہو چکا ہے۔

اسی سے منسلک ایک انتہائی معتبر انسان بلکہ ادارہ کا ذکر کرنا لازم ہے۔لائل پور کے امین پور بازار میں واقع ''رحمت گراموفون''۔یہ محض ایک دکان نہیں تھی۔ایک انسان کے موسیقی سے محبت کی انمٹ اُمنگ تھی۔امرتسر سے آئے ہوئے حاجی رحمت نے 1949 میں یہ دکان کھولی تو یقین فرمایئے کہ ایک نئے باب کا آغاز ہوگیا۔ساتھ ساتھ حاجی رحمت نے ایک سٹوڈیو بھی قائم کر رکھا تھا۔جس میں علاقائی موسیقی پر خصوصی زور دیا جاتا تھا۔رحمت گراموفون کے پاس برصغیر کے جید گلوکاروں کے اَن گنت ریکارڈ موجود تھے۔یہ دکان موسیقی کی ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتی تھی۔بڑے بڑے نامور لوگ جنہیں لوگ سنکر سر دھنتے ہیں۔دراصل رحمت گراموفون کی پیداوار ہیں۔نام سنیے۔دنگ رہ جائینگے۔نصرت فتح علی خان،عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی،منصور ملنگی،اللہ دتہ لونے والا اورعزیز میاں قوال،ان تمام کی ابتداء رحمت گراموفون کے سٹوڈیو سے ہوئی تھی۔فہرست ختم نہیں ہوئی۔عالم لوہار،فتح علی خان اورمبارک علی خان بھی اسی مقام کے خوشہ چیں تھے۔ایک بار لتا منگیشکر نے ممبئی سے دکان پر فون کر کے پوچھا تھا کہ میرا پہلا گانا کیا آپکے پاس موجود ہے۔جب اسے پہلے گانے کی تفصیل بتائی گئی تو ششدر رہ گئی۔کیونکہ یہ گانا ہندوستان کے بڑے بڑے سٹوڈیو میں موجود نہیں تھا۔رحمت گراموفون اب بند ہو چکا ہے۔اسکی جگہ ایک کاروباری عام سی دکان موجود ہے۔شائد فیصل آباد کی اکثریت کو یاد بھی نہ ہو کہ رحمت گراموفون نامی موسیقی کی ایک درسگاہ یہاں موجود تھی۔موسیقی کا ہمارے ملک میں کیا مستقبل ہے۔اس پر کچھ بھی کہنا محال ہے بلکہ ناممکن ہے۔آج کل کے گانے سنکر تو یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ موسیقی اصل میں ہے کیا۔پرانے گلوکاروں کو سننے کے بعد موجودہ گلوکاروں کی واضح اکثریت کو سننا سمع خراشی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔مگر غلام نبی چلہن کو دیکھ کر حوصلہ ہوتا ہے۔کپڑے سینے کا فن تو خیر اسے آتا ہی ہے۔مگر موسیقی کے ذریعے دلوں اورعلاقوں کو پرونے کا مشکل ترین کام انہماک سے کیے جا رہا ہے۔کسی غرض اوربغیر کسی لالچ کے۔درحقیقت وہ موسیقی کا درزی ہے۔کمال بات۔حد درجہ قابل تعریف۔مگر کون اس سفید پوش کی تعریف کریگا۔بلکہ موجودہ حالات میں کیوں کریگا!

راؤ منظر حیات